حدیث اور سنت بطور ماخذ شریعت

ڈاکٹر محمود احمد غازی

قرآن وسنت میں جو کچھ آیا ہے اس کو اصطلاح میں نصوص کہا جاتا ہے۔ نصوص کی دو قسمیں ہیں۔ کچھ نصوص وہ ہیں جن کو قطعی الثبوت کہا جاتا ہے۔ یعنی ان کا ثبوت قطعی اور یقینی دلائل کے ساتھ ہمارے سامنے ہو چکا ہے۔ قرآن مجید سارے کا سارا قطعی الثبوت ہے۔ احادیث اور سنت میں بھی خاصا بڑا حصہ قطعی الثبوت ہے۔ مثلاً سب کی سب متواتر احادیث اور سنن ثابتہ قطعی الثبوت ہیں۔ لیکن کچھ احادیث ہیں جو تواتر کے کسی درجے تک نہیں پہنچیں، وہ قطعی الثبوت نہیں ہیں اور ان کا درجہ قرآن کریم اور سنت متواترہ سے کم ہے، گویا کچھ نصوص ہیں جو قطعی الثبوت ہیں اور کچھ نصوص ہیں جو ظنی الثبوت ہیں۔ اسی طرح سے معانی اور مطالب کے اعتبار سے بھی ان نصوص کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ ہے جو قطعی الدلالت ہے جس کے معنیٰ اور مفہوم بالکل قطعی اور یقینی ہیں، جن میں کسی اختلاف رائے کی یا کسی دوسری تعبیر کی گنجائش نہیں ہے۔ مثلاً قرآن پاک میں ہے اقیموا الصلوٰۃ نماز قائم کرو، اب ہر شخص جو تھوڑی بہت بھی عربی جانتا ہے اور اسلام کی تعلیم سے تھوڑا سا بھی واقف ہے وہ سمجھتا ہے کہ اقیموا الصلوٰۃ سے کیا مراد ہے، اس میں کسی دو تعبیروں کی گنجائش نہیں ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ کچھ نصوص ایسے ہیں جن میں ایک سے زیادہ تعبیروں کی گنجائش ہے۔ اور یہ گنجائش اللہ اور رسول نے ایک مصلحت سے رکھی ہے۔ جہاں اللہ اور رسول کی حکمت اور منشا یہ تھا کہ شریعت کے احکام کو ایک سے زیادہ انداز سے سمجھا جا سکے، وہاں انہوں نے ایسا اسلوب اور ایسا طرز بیان اختیار کیا جس میں ایک سے زائد تعبیرات کی گنجائش موجود ہے۔ قرآن مجید میں بہت سے الفاظ ہیں جو مشترک معنیٰ کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ قرآن پاک فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ ترین معیار پر ہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی ایسا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے عربی زبان میں ایک سے زائد معنی ہیں اور وہاں سیاق وسباق میں کوئی ایسا قرینہ بھی نہیں رکھا گیا جس سے ایک معنیٰ متعین ہو سکیں تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ

اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ قرآن مجید کی کچھ نصوص کو ایک سے زائد انداز میں سمجھا جا سکے۔

اسی طرح سے حدیث پاک میں بھی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ ترین معیار پر ہیں۔ اس لئے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام افصح العرب تھے۔ کسی کا یہ تصور کرنا انتہائی بے بنیاد اور مہمل بات ہوگی کہ نعوذ باللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بات تو واضح کہنا چاہتے تھے لیکن کہہ نہیں سکے۔ واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس موقع پر جو بات ارشاد فرمانا چاہتے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر وہی ارشاد فرمائی اور اس سے جو مفہوم نکلتا ہے وہی مفہوم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود تھا۔ یہ کہنا بالکل غلط اور بے بنیاد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو کسی خاص حکم سے اپنے ذہن میں ایک خاص مقصد رکھتے تھے۔ لیکن چونکہ لغت کے اعتبار سے اس لفظ کے ایک سے زیادہ مفاہیم نکل سکتے تھے اس لئے لوگوں نے اس کو اور طرح سمجھ لیا، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی منشا کے خلاف تھا۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ جس چیز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوٹوک اور قطعی انداز میں ارشاد فرمانا چاہا، اسے دوٹوک اور قطعی انداز میں ارشاد فرمایا، اور جس چیز کے بارے میں آپ کا ارادہ یہ تھا کہ اس کو لوگ اپنے اپنے اندر سے سمجھیں، وہ بات آپ نے اس طرح ارشاد فرمائی کہ لوگ اس کو اپنے اپنے انداز سے سمجھے۔

ان دونوں کی ایک ایک مثال، میں، آپ کو دے دیتا ہوں۔ ایک قرآن پاک سے اور ایک حدیث سے۔ قرآن پاک میں ایک جگہ آیا ہے کہ اگر کسی شوہر اور بیوی میں اختلاف ہو جائے اور شوہر بیوی کو طلاق دے دے تو جب تک وہ مطلقہ خاتون عدت میں ہے اس وقت تک اس کے اخراجات اس کے شوہر کے ذمے ہوں گے۔ اس موقع پر ارشاد ہوا۔

﴿علی الموسع قدرہ وعلی المقتر قدرہ﴾: خوشحال پر اپنی استطاعت کے مطابق اور نادار پر اپنی استطاعت کے مطابق۔

﴿متاعاً بالمعروف﴾ اس علاقے اور اس زمانے کے معروف طریقے کے مطابق ضروری ساز و سامان دے۔ یہ الفاظ قرآن پاک میں آئے ہیں جن کے قطعی الثبوت ہونے میں کوئی شک نہیں۔ لیکن موسع سے کیا مراد ہے؟ مقتر سے کیا مراد ہے؟ یہ ہر زمانے کے لحاظ سے الگ الگ طے ہو سکتا ہے۔ ایک غریب ماحول میں، ایک فقیر ملک میں دولت مند اور موسع کا مفہوم اور ہوگا اور نادار اور مقتر کا مفہوم الگ ہوگا۔ ایک انتہائی دولت مند ملک میں، مثلاً کویت میں اگر کہا جائے کہ دولت مند اپنی استطاعت کے مطابق دے اور نادار اپنی استطاعت کے مطابق دے، تو کویت کے ماحول میں نادار کے معنیٰ اور ہوں گے، پاکستان کے ماحول میں نادار کے معنیٰ اور ہوں گے، پاکستان سے بھی زیادہ کوئی غریب فقیر ملک ہوگا تو وہاں نادار کے معنیٰ اور ہوں گے۔ ایسا اس لئے رکھا گیا کہ اللہ کی مشیت اور منشا یہ تھا کہ چونکہ ناداری اور دولت مندی اضافی چیزیں ہیں اس لئے ان کو اپنے اپنے زمانے کے لحاظ سے سمجھا جائے اور اپنے اپنے زمانے کے لحاظ سے اس کے معنیٰ متعین کئے جائیں۔ اس کے لئے معروف کی قید بھی لگا دی، جس سے یہ بات مزید واضح ہو گئی کہ اس کی بہت سی تعبیریں ممکن ہیں۔ مثال کے طور پر پاکستان کے کسی دیہات میں اگر کسی خاتون کو یہ آزمائش پیش آ جائے اور وہ متاع کا مطالبہ کرے تو غالباً یہ

کافی ہوگا کہ اس کو رہنے کے لئے مکان دے دیا جائے، اس مکان میں ضروری ساز وسامان ہو، دووقت کھانے کا انتظام ہو، ناشتے کا انتظام ہو، کپڑے ہوں اور ضروری ساز وسامان ہو۔ شاید اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ ہمارے ہاں یہی معروف ہے۔ جو دولت مند ہوگا، وہ پختہ مکان دے دے گا، غریب کچا مکان دے دے گا۔ دولت مند آدمی شاید گھر میں گھوڑا بھی رکھوادے گا، تانگہ بھی رکھوادے۔ غریب آدمی یہ چیزیں نہیں رکھ سکے گا۔

لیکن اگر یہی واقعہ کسی کے ساتھ پیرس میں پیش آجائے تو موسع اور مقتر کے معنیٰ اور ہوں گے۔ وہاں مطلقہ خاتون یہ مطالبہ کرسکتی ہے کہ جو گھر مجھے رہنے کے لئے دیا گیا ہے اس میں ریفریجریٹر بھی رکھا ہو، اس میں سینٹرل ہیٹنگ کا نظام بھی ہو، اس میں ٹیلیفون کی لائن بھی لگی ہوئی ہو۔ اس لئے کہ یہ چیزیں وہاں ناگزیر ہیں اور ہر آدمی کے پاس ہوتی ہیں۔ وہاں نادار سے نادار آدمی بھی ان چیزوں کے بغیر گزارہ نہیں کرسکتا۔ لیکن پاکستان میں کوئی نادار خاندان یہ مطالبہ کرے تو شاید وہ حق بجانب نہ ہو۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ شریعت کے احکام میں بعض جگہ اللہ کی حکمت ہی اس بات کی متقاضی رہی ہے کہ اس کے معنیٰ اور مطالب کو زیادہ سے زیادہ عمومی انداز میں سمجھا جاسکے، اور ہر علاقے کے لوگ اپنے حالات کے لحاظ سے، ہر زمانے کے لوگ اپنے ماحول کے لحاظ سے اس کو سمجھ سکیں۔ یہ معنیٰ ہیں ظنی الدلالت کے، یعنی جس کے معانی اور دلالت کے مفاہیم ظنی ہیں۔ آپ اپنے ظن غالب، فہم وبصیرت اور خیال سے شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے اس کے معنیٰ اور مطالب متعین کرلیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے پوچھا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم بدوی لوگ ہیں، ریگستان میں سفر کرتے ہیں، ریگستان میں سب سے کم یاب چیز پانی ہوتی ہے، بعض اوقات ہم گزرتے ہیں، راستے میں کوئی تالاب یا گڑھا نظر آتا ہے، اس میں پانی جمع ہے، یا کسی پہاڑ کے دامن میں پانی جمع ہے۔ اب ہمیں نہیں معلوم کہ یہ پانی پاک ہے کہ ناپاک ہے۔ اس میں کسی درندے نے منہ تو نہیں ڈالا۔ کسی ناپاک جانور نے اس کو ناپاک تو نہیں کیا تو ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں جو ارشاد فرمایا، مختلف احادیث میں مختلف الفاظ آئے ہیں، ایک حدیث کے الفاظ ہیں: الماء الکثیر لاینجس، کہ زیادہ پانی ناپاک نہیں ہوتا۔ ایک اور جگہ فرمایا: الماء الکثیر طھور لاینجسہ شیء، کہ زیادہ پانی پاک ہے، کوئی چیز اس کو ناپاک نہیں کرسکتی۔ اب ذرا غور فرمائیے کہ یہ الفاظ کہ ''زیادہ پانی ناپاک نہیں ہوتا'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو افصح العرب ہیں، آپ کی زبان مبارک سے ارادتاً اور سوچ سمجھ کر نکلے ہیں۔ یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی حکمت تشریع کے پیش نظر ایسے عمومی الفاظ استعمال فرمائے جن کی متعدد تعبیریں ممکن ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تو مثلاً یہ فرمادیتے کہ پانی دس یا بیس رطل (ایک پیمانہ) ہو تو ناپاک نہیں ہوتا۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے الماء الکثیر کے الفاظ استعمال فرمائے۔ الماء الکثیر سے کیا مراد ہے؟ کتنا پانی، جتنا کسی بڑے تالاب میں ہوتا ہے؟ اتنا پانی جتنا راول ڈیم میں ہے؟ اتنا پانی جتنا ایک ٹب میں بھرا ہوا ہے، یا اتنا پانی جو

ایک کولر میں بھرا ہوا ہے؟ الماء الکثیر کے مفہوم میں لغوی اعتبار سے یہ سب شامل ہیں۔

ہمارے شہر میں شاید ہم ماء کثیر کا یہ مفہوم قرار دیں کہ راول ڈیم کا پانی ماء کثیر ہے، اس لئے کہ اس میں زیادہ پانی ہے۔ لیکن بلوچستان کے بعض علاقوں میں جہاں دس دس میل پانی نہیں ملتا، وہاں کے لوگوں کے نزدیک ایک ایک مشک بھر پانی بھی بہت اور ماء کثیر ہے۔ بعض اور علاقے ایسے ہوں گے جہاں ایک مٹکا پانی بھی بہت زیادہ یعنی ماء کثیر قرار دیا جائے گا۔ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جان بوجھ کر، سوچ کر اور حکمت کی وجہ سے یہ بات ارشاد فرمائی کہ ہر علاقے کے لوگ اپنے حالات کے لحاظ سے اس اصطلاح کے معنیٰ متعین کرلیں۔ چنانچہ امام ابوحنیفہؒ کے سامنے جب یہ حدیث اور اس کی تعبیر کا مسئلہ آیا تو وہ کوفے میں بیٹھے ہوئے تھے، جہاں ایک طرف دریائے دجلہ بہتا تھا، دوسری طرف فرات بہتا تھا۔ تو ان کے ذہن میں مائے کثیر کا تصور یہ آیا کہ اتنا بڑا تالاب کہ اگر کوئی ایک طرف سے اس کے پانی کو ہلائے تو اس کی لہر دوسرے کنارے تک نہ پہنچے۔ اس کے برعکس امام مالکؒ جو مدینہ منورہ میں تشریف فرما تھے جہاں صرف دو کنویں تھے اور ان میں بھی ایک یہودی کا تھا، اور پانی کی قلت تھی۔ امام مالکؒ نے ایک اور روایت کے الفاظ سے استدلال کرتے ہوئے کہا کہ دو ایسے بڑے مٹکے جو لوگ گھروں میں پانی کے لئے رکھتے ہیں وہ اگر پانی سے بھرے ہوئے ہوں تو یہ ماء کثیر ہے۔ اب آپ دیکھیں دونوں میں بڑا فرق ہے۔ اتنا بڑا تالاب جس میں کم وبیش دس ہزار مٹکے آجائیں، وہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مائے کثیر ہے۔ اس کے برعکس امام مالکؒ کے نزدیک ماء کثیر وہ ہے جو دو مٹکوں میں سما جائے۔ یہ دونوں مسالک اپنی جگہ درست ہیں، اس لئے کہ حدیث کے الفاظ میں دونوں کی گنجائش موجود ہے۔ مدینہ میں مائے کثیر یہ ہے، کوفے میں مائے کثیر وہ ہے۔ اس طرح کی احادیث اور آیات قرآنی جن میں ایک سے زیادہ تعبیروں کی گنجائش ہو وہ ساری تعبیریں کم از کم لغوی اعتبار سے بیک وقت درست ہوسکتی ہوں۔ ضروری نہیں کہ ہر وقت درست ہوں۔ یہ چیز ہے جس کو ظنی الدلالت کہتے ہیں، یعنی وہ نص جس کا معنیٰ ومفہوم ظنی ہو۔

لہٰذا نصوص شریعہ کی چار قسمیں ہوگئیں۔ ظنی الثبوت اور قطعی الدلالت دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملائیں تو چار قسمیں بنتی ہیں۔ یہ چاروں قسمیں احکام شریعت کا ماخذ ہیں اور اسی ترتیب کے ساتھ ہیں۔ سب سے پہلے وہ چیزیں جو قطعی الثبوت بھی ہے اور قطعی الدلالت بھی ہے جس میں قرآن پاک کی وہ آیات جو محکم ہیں اور سنت متواترہ اور احادیث ثابتہ میں جو محکمات ہیں شامل ہیں۔ پھر ان نصوص کا درجہ ہے جو قطعی الثبوت اور ظنی الدلالت ہیں۔ پھر وہ نصوص ہیں جو ظنی الدلالت ہیں اور قطعی الثبوت ہیں۔ پھر وہ نصوص ہیں جو ظنی الدلالت ہیں اور ظنی الثبوت ہیں۔ یہ ترتیب ہے جس سے احادیث اور آیات دونوں سے احکام کا استدلال ہوتا ہے۔

یہ گفتگو بڑی تفصیل کی متقاضی ہے کہ ان چاروں درجات میں جب استنباط اور استدلال کا عمل شروع کیا جائے گا تو اگر ان دونوں میں کسی میں تعارض ہو تو اس کو کیسے حل کیا جائے گا۔ لیکن ایک عام بات جو کامن سینس اور عقل عام کی بات

ہے وہ یہ کہ پہلی صورت کو ترجیح دی جائے گی اور سر دست دوسری صورت کو نظر انداز کر دیا جائے گا۔ اس لئے جب سنت کی بات بطور ماخذ شریعت کے ہوتی ہے تو ہمارے سامنے چاروں چیزیں رہتی ہیں۔ یہ چاروں چیزیں سنت میں بھی پائی جاتی ہیں۔ قرآن پاک میں ان میں سے دو چیزیں پائی جاتی ہیں اور دو نہیں پائی جاتیں۔ قرآن پاک سارے کا سارا قطعی الثبوت ہے اس لئے ظنی الثبوت والی صورت قرآن پاک میں نہیں پائی جاتی۔ احادیث میں کچھ قطعی الثبوت ہیں کچھ ظنی الثبوت ہیں۔ قطعی الدلالت اور ظنی الدلالت قرآن پاک میں بھی ہیں اور حدیث میں بھی ہیں۔ اس لئے ان چاروں صورتوں کا انطباق احادیث پر زیادہ ہوتا ہے قرآن پاک کی آیات پر کم ہوتا ہے۔

ایک حدیث میں بیان ہوا ہے کہ **الا انی اوتیت القرآن و مثلہ معہٗ** یاد رکھو مجھے قرآن پاک بھی دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اس جیسی رہنمائی اور بھی دی گئی ہے۔ قرآن پاک کی متعدد آیات سے، جن کی تعداد سینکڑوں میں ہے، یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول قرآن کے علاوہ بھی وحی ہوتی تھی جو سنت اور حدیث کی رہنمائی کی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔

اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چار فرائض کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ﴿**یتلوا علیھم آیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ**﴾ یہ جو آخری تین فرائض ہیں یہ تلاوت کتاب سے ہٹ کر ہیں، تلاوت آیات سے مختلف چیزیں ہیں۔ تلاوت آیات تو قرآن پاک کا بیان کر دینا ہوا۔ پھر ﴿**یعلمھم الکتاب والحکمۃ ویزکیھم**﴾ یہ تین کام ہیں۔ ان کا طریقہ کار کیا تھا۔ اس کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ہدایات یا رہنمائی فرمایا کرتے تھے وہ رہنمائی کیا تھی؟ وہ رہنمائی سنت کی شکل میں آج ہمارے سامنے ہے۔

خود قرآن مجید میں تین چار مقامات پر قرآن کی تبیین کا فریضہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کیا گیا ہے۔ ﴿**لتبین للناس مانزل الیھم**﴾ تاکہ آپ وہ تمام چیزیں ان کے لئے بیان کر دیں جو ان کے لئے نازل کی گئی ہیں۔ یعنی قرآن پاک کی آیات اور مطالب کا بیان کرنا، بیان سے مراد محض تلاوت آیات نہیں ہے، بلکہ بیان کرنے سے مراد یہ ہے کہ اس کے معانی و مطالب کو بیان کر دیا جائے۔ اس کے مقاصد کی تشریح کی جائے۔ اس میں جو سبق پنہاں ہے اس کو روز روشن کی طرح واضح کر دیا جائے۔ اس میں جہاں جہاں انسانی ذہن کی نارسائی کی وجہ سے الجھاؤ کا امکان پیدا ہو سکتا ہے اس ممکنہ الجھاؤ کو دور کیا جائے۔ جہاں جہاں غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے، اس غلط فہمی کے راستوں کو بند کر دیا جائے۔ یہ ساری چیزیں بیان و تبیین میں شامل ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے جو بیان جاری ہوتا تھا، علمائے اسلام نے اس کی قسمیں بیان کی ہیں۔ ایک مشہور صحابیؓ ہیں، حضرت عمران بن حصینؓ۔ وہ ایک مرتبہ اپنے حلقہ درس میں کچھ مسائل بیان فرما رہے تھے۔ اس زمانے میں خوارج میں سے بعض جاہل اور انتہا پسند لوگ اس طرح کی باتیں کیا کرتے تھے، جیسے آج کل کے منکرین

حدیث کرتے ہیں۔ان میں سے کوئی خارجی باہر سے آیا ہوا تھا۔اس نے آکر کہا کہ **لا تحدثنا بالا حادیث** آپ ہمیں احادیث نہ سنائیں، حدثنا بالقرآن ،قرآن پاک کی باتیں بتائیں۔حضرت عمران بن حصینؓ نے قدرے ناگواری سے فرمایا کہ میں قرآن ہی کی باتیں بیان کررہا ہوں۔قرآن میں اگر نماز کا حکم ہے تو تمہیں کہاں سے پتہ چلے گا کہ ظہر کی رکعتیں چار ہیں، عصر کی چار ہیں اور مغرب کی تین ہیں۔یہ اگر میں سنت سے نہیں بیان کروں گا تو تمہیں کہاں سے معلوم ہوگا۔سنت سے بیان کروں گا تو یہ قرآن ہی کا بیان ہے۔یہ قرآن ہی کا درس ہے،قرآن سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔پھر آپ نے فرمایا کہ خذوا عنا آج یہ ساری معلومات ہم سے لے لو،اگر تم نہیں لوگے تو پھر تمہارے اندر بڑا اختلاف پیدا ہوگا اور تم ایسے معاملات اور مسائل میں الجھ جاؤ گے جن سے نکلنے کا تمہارے سامنے کوئی راستہ نہیں ہوگا۔

آگے چلنے سے پہلے ایک اور چیز ذہن میں رکھیں، وہ سنت کی ایک خاص قسم ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی دو طریقوں سے آتی تھی۔ایک وہ وحی ہوتی تھی جو وحی جلی کہلاتی ہے۔یعنی جس کے الفاظ، جس کی عبارتیں اور کلمات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے تھے، اور جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی دخل نہیں تھا۔یہ وہ وحی تھی جس کے الفاظ اور کلمات معجز ہیں، جس کا اسلوب، معیار فصاحت و بلاغت معجزے کی سطح تک پہنچی ہوئی ہے، یہ وحی قرآن مجید کہلاتی ہے۔

اس کے علاوہ جو وحی ہوتی تھی وہ متعین الفاظ میں نہیں ہوتی تھی وہ سنت ہے۔جس کے صرف معنیٰ اور مفاہیم حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک منتقل ہوئے۔یہ وحی بعض اوقات جبرئیل امینؑ کے ذریعے سے نزل ہوئی۔بعض اوقات کسی اور ذریعے سے بھی نازل ہوئی۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں کوئی چیز دیکھی، یا ویسے اللہ نے دل میں کوئی چیز ڈال دی۔سنت حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچانے کے لئے وحی خفی کی رہنمائی کے کئی طریقے تھے، جس میں وہ طریقہ بھی شامل تھا جس طریقے پر قرآن مجید نازل ہوتا تھا، اس کے علاوہ بھی کئی طریقے شامل تھے، یہ وحی، وحی خفی کہلاتی ہے۔

دوسری وحی جلی ہے، جو اپنے الفاظ کے ساتھ نازل ہوتی تھی، وحی خفی صرف معانی اور پیغام پر مشتمل ہوتی تھی جس میں الفاظ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں تھے، لیکن معانی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائے گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے الفاظ میں اس کو بیان فرمایا۔میں دوسری وحی یعنی وحی خفی میں ایک خاص قسم وہ ہے جو بقیہ تمام اقسام سے منفرد حیثیت رکھتی ہے، تعداد میں بھی تھوڑی ہے، لیکن اس کا ایک خصوصی مقام ہے جس کے لئے اس کو حدیث قدسی کہا گیا ہے، وہ دراصل اللہ تعالیٰ ہی کا کلام ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ادا ہوا ہے۔اللہ تعالیٰ یا تو صیغہ واحد متکلم یا جمع متکلم میں ارشاد فرماتے ہیں، لیکن بیان کرنے والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔اس کے الفاظ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں اس لئے یہ وحی قرآن مجید میں شامل نہیں ہے، اس کی تلاوت نہیں ہوتی، وہ قرآن مجید میں نہیں لکھی جاتی، لیکن وہ اللہ کا کلام ہے۔

احادیث قدسیہ کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔کل احادیث کی تعداد اگر پچاس ہزار ہو، جیسا کہ بعض لوگوں کا اندازہ ہے یا

تیس ہزار ہو جیسا کہ کچھ اور لوگوں کا اندازہ ہے۔ تو ان میں سے چند سو احادیث قدسیہ کہلاتی ہیں۔ کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ ان کی تعداد تین سو کے لگ بھگ ہے۔ احادیث قدسیہ کے مجموعے الگ سے بھی شائع ہوئے ہیں۔ تقریباً ایک درجن مجموعے ہیں جن میں احادیث قدسیہ الگ الگ شائع کر دی گئی ہیں۔ ایک مجموعے میں ایک سو کے قریب احادیث ہیں، ایک دوسرے مجموعے میں دو سو بہتر احادیث ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تعداد تین سو کے لگ بھگ ہے۔

احادیث قدسیہ اور قرآن مجید کے درمیان دس بنیادی فرق ہیں۔ پہلا فرق تو یہ ہے کہ قرآن مجید معجزہ ہے، احادیث قدسیہ معجزہ نہیں ہیں۔ یعنی قرآن کے الفاظ اور عبارت کی فصاحت و بلاغت اور کلمات کی بندش و بلندی، یہ معجزہ ہے۔ احادیث قدسیہ میں ضروری نہیں کہ معجزہ ہو۔ ہوسکتا ہے کہ معجزہ ہونے کی حد تک، بہت اونچا معیار ہو، ہوسکتا ہے کہ نہ ہو۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ قرآن مجید کی روایت بالمعنیٰ جائز نہیں ہے، قرآن مجید کے مفہوم کو آپ اپنے الفاظ میں بیان کر دیں اور کہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ **ھذا کتاب لاشک فیہ** یہ عربی زبان میں، میں نے روایت بالمعنی کی ہے، یہ جائز نہیں ہے۔ یہ حرام ہے۔ مجھے یہ کہنا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، **ذلک الکتاب لاریب فیہ**۔ لیکن اگر میں اس مفہوم میں حدیث قدسی کو بیان کر دوں تو یہ جائز ہے کہ حدیث قدسی میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے پھر مفہوم کو اپنے الفاظ میں بیان کر دوں اور نقل کر دوں تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے، یہ حرام نہیں ہے۔ اگرچہ افضل یہی ہے کہ اصل الفاظ میں بیان کیا جائے۔

تیسرا فرق یہ ہے کہ قرآن پاک اگر کہیں لکھا ہوا ہو تو بیشتر فقہا کے نزدیک بے وضو اس کو ہاتھ لگانا جائز نہیں ہے۔ البتہ اگر حدیث قدسی لکھی ہوئی ہو تو بغیر وضو اس کو ہاتھ لگانا جائز ہے، اگرچہ ادب کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔

چوتھا فرق یہ ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت اس شخص کے لئے جائز نہیں ہے جس پر غسل فرض ہو، لیکن حدیث قدسی اس حالت میں بھی پڑھ سکتا ہے۔ اگرچہ ادب اور احترام کا تقاضا یہ ہے کہ نہ پڑھے۔

پانچواں فرق یہ ہے کہ قرآن مجید کی نماز میں تلاوت ہوتی ہے، حدیث قدسی کی نماز میں تلاوت نہیں ہوسکتی۔ اگر کوئی شخص حدیث قدسی نماز میں پڑھ لے تو تلاوت کا جو رکن ہے اور فرض ہے، وہ ادا نہیں ہوگا۔ قرآن پاک کے بارے میں کہا گیا ہے کہ جو شخص ایک حرف کی تلاوت کرے اس کو دس نیکیاں ملیں گی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، انہوں نے فرمایا کہ **لا اقول: الم حرف** پہلے انہوں نے حدیث بیان فرمائی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے قرآن پاک کے ایک حرف کی تلاوت کی اس کو دس نیکیوں کا ثواب ملے گا۔ پھر انہوں نے اپنی فہم بیان فرمائی کہ میں یہ نہیں کہتا کہ الم میں ایک حرف ہے، **بل الف حرف ولام حرف و میم حرف**، الف الگ حرف ہے، لام الگ حرف ہے، میم الگ حرف ہے، یہ خصوصیت صرف قرآن پاک کی ہے جو حدیث قدسی کو حاصل نہیں ہے۔ حدیث قدسی آپ پڑھیں تو اس میں اتنا اجر نہیں ہے جو قرآن پاک کی تلاوت میں ہے۔

چھٹا بڑا فرق یہ ہے کہ قرآن پاک وحی جلی ہے اور حدیث قدسی وحی خفی ہے۔ ساتواں فرق یہ ہے کہ قرآن پاک روح امین یا جبرئیل لے کر نازل ہوتے تھے۔ جبکہ حدیث قدسی کسی بھی طریقے سے آسکتی تھی۔ آٹھواں فرق یہ ہے کہ قرآن وحی متلو ہے جس کی تلاوت ہوتی ہے۔ حدیث قدسی وحی متلو نہیں ہے، اس کی تلاوت نہیں ہوتی۔ نواں فرق یہ ہے کہ قرآن مجید کے الفاظ متواتر ہیں۔ ضروری نہیں کہ حدیث قدسی بھی متواتر ہو۔ اگرچہ ایک دو قدسی حدیثیں ایسی ہیں جو کہ متواتر بھی ہیں، لیکن اکثر احادیث قدسیہ متواتر نہیں ہیں۔ دسواں فرق یہ ہے کہ قرآن پاک مصاحف میں لکھا ہوا ہے اور یکجا موجود ہے، احادیث قدسیہ مصاحف میں نہیں ہیں اور کسی ایک سرکاری یا باضابطہ مجموعے میں یکجا موجود نہیں ہیں۔

احادیث اور سنت کا جو ذخیرہ ہمارے پاس موجود ہے یہ درجنوں نہیں بلکہ سینکڑوں کتابوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتابیں جو آج کتب حدیث کی ہمارے پاس موجود ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔ کچھ کتابیں تو وہ ہیں جن کو ان کتابوں کے قابل احترام اور جلیل القدر مرتبین نے براہ راست روایت کر کے مرتب کیا ہے۔ اور کچھ کتابیں وہ ہیں جن کی تعداد زیادہ ہے جو محدثین نے براہ راست روایت کر کے مرتب نہیں کیں بلکہ دوسرے مجموعے سامنے رکھ کر ان مجموعوں سے احادیث کا انتخاب کر کے ان مجموعوں کو مرتب کیا ہے۔

آخری کتاب جو براہ راست روایت کر کے مرتب ہوئی ہے وہ امام بیہقی کی السنن الکبریٰ ہے۔ امام بیہقیؒ اس اعتبار سے سب سے بڑے اور نمایاں محدث ہیں کہ ان کی کتاب آخری کتاب ہے جو براہ راست روایت کر کے مرتب کی گئی ہے۔ ان کے بعد براہ راست حدیث روایت کر کے مرتب کرنے والے دنیا سے ختم ہو گئے۔

امام بیہقیؒ کی وفات ۴۵۸ھ میں ہوئی۔ ۴۵۸ھ کے بعد جتنی کتابیں ہیں وہ ثانوی کتابیں ہیں۔ ثانوی سے مراد وہ کتاب ہے جو کسی ایک یا دو تین قدیم تر مجموعوں کو سامنے رکھ کر کسی نے اپنا مجموعہ مرتب کیا ہو، تلخیص کی ہو، شرح کی ہو یا چند کتابوں سے ایک ہی موضوع کی احادیث نکال کر جمع کی ہوں۔ یہ تو ہوتا رہا ہے اب بھی ہوتا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔ لیکن براہ راست روایت کر کے محدث نے اپنے اساتذہ سے سن کر جمع کی ہوں، انہوں نے اپنے اساتذہ سے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پوری سند بیان کی ہو پھر احادیث جمع کی ہوں، یہ کام آخری بار امام بیہقیؒ نے کیا ہے۔ ان کے بعد کسی نے نہیں کیا۔

امام بیہقیؒ کی یوں تو بہت سی کتابیں ہیں، لیکن سنن کے نام سے دو کتابیں ہیں۔ ایک السنن الصغریٰ کہلاتی ہے جو دو جلدوں میں ہے اور کم و بیش پانچ ہزار احادیث پر مشتمل ہے۔ دوسری طویل کتاب دس ضخیم جلدوں میں ہے، انہوں نے براہ راست یہ سارا ذخیرہ مرتب کیا ہے۔ حدیث کی بنیادی کتابوں میں سب سے بڑی کتاب ان کی ہے، اپنے ماخذ کے اعتبار سے بھی اور اپنے تنوع کے اعتبار سے بھی۔ یہ سنن کہلاتی ہے کیونکہ فقہی احکام کی ترتیب پر ہے، لیکن اس میں حدیث کے تمام مباحث اور مضامین پر احادیث موجود ہیں اس لئے یہ سنن کبریٰ بھی کہلاتی ہے اور جامع بھی کہلاتی ہے۔ لیکن سنن

کبریٰ کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔

موطا امام مالکؒ سے لے کر اور سنن کبریٰ بیہقی تک آج ہمارے پاس کتب حدیث کا جو ذخیرہ موجود ہے یہ سب کا سب ایک درجے کی احادیث پر مشتمل نہیں ہے۔ ان میں مندرج احادیث کے درجات مختلف ہیں۔ قرآن پاک سارے کا سارا ایک درجے کا ہے۔ وہ سب قطعی الثبوت ہے۔ الحمد سے لے کر والناس تک۔ سب ثبوت کے لحاظ سے ایک ہی درجے کا ہے۔ اس کے ایک حرف میں بھی کوئی فرق نہیں ہے۔ اس کا زیر زبر سب ایک درجے کی چیز ہے۔ احادیث میں درجات ایک جیسے نہیں ہیں، بلکہ احادیث کے مختلف درجات ہیں۔

درجات، صحت اور قبول کے اعتبار سے علمائے اسلام نے کتب حدیث کے پانچ درجے قرار دیئے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے تین درجے قرار دیئے ہیں۔ بعض اور محدثین نے چار درجے قرار دیئے ہیں۔ چار درجے ہوں یا پانچ یا تین درجے ہوں، اصل حقیقت کے اعتبار سے ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے تین درجے قرار دیئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ درجہ اول میں صرف وہ کتابیں شامل ہیں جن میں تمام احادیث صحیح ہیں اور مستند ہیں۔ کوئی ایک حدیث بھی ان میں ایسی نہیں ہے جو صحت کے اعلیٰ ترین معیار سے ہٹی ہوئی ہو۔ وہ تقریباً تمام محدثین کے نزدیک اتفاق رائے سے تین کتابیں ہیں، تقریباً کا لفظ میں نے اس لئے استعمال کیا کہ شاید ایک آدھ کا کوئی جزوی اختلاف ہوگا۔

احادیث کی یہ تین کتابیں صحت کے اعلیٰ ترین درجے پر فائز ہیں۔ موطا امام مالک، جس کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ اصح الکتاب بعد کتاب اللہ ہے۔ کتاب اللہ کے بعد صحیح ترین کتاب بعض لوگوں کے خیال میں موطا امام مالکؒ ہے۔ امام شافعیؒ جو بہت بڑے محدث بھی ہیں اور بہت بڑے فقیہ بھی ہیں وہ موطا امام مالکؒ کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ قرار دیتے ہیں۔ موطا امام مالکؒ کے بعد صحیح بخاری کا درجہ ہے۔ جو مسلمانوں کی غالب ترین اکثریت کی نظر میں اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے، یعنی اللہ کی کتاب کے بعد صحیح ترین کتاب روئے زمین پر صحیح بخاری ہے۔ تیسرا درجہ صحیح مسلم کا ہے جو بعض اہل مغرب کے نزدیک اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے۔ اہل مغرب سے مراد یورپ یا امریکہ والے نہیں ہیں، بلکہ اسلامی اصطلاح میں اہل مغرب سے مراد اسپین، اندلس، مراکش، الجزائر اور تیونس کے علاقے ہیں۔ یہ مغاربہ یا اہل مغرب کہلاتے تھے، یہ پورا علاقہ دنیائے اسلام کے انتہائی مغرب میں تھا۔ اس لئے وہاں کے لوگوں کی رائے بیان کرنا ہو تو مغاربہ یا اہل مغرب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

یہ بحث ہمیشہ مسلمانوں میں چلتی رہی کہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ ان تینوں میں سے کون سی کتاب ہے۔ جو حضرات موطا امام مالکؒ کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ قرار دیتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ موطا امام مالکؒ میں جتنی احادیث آئی ہیں وہ تمام کی تمام مستند ترین اور صحیح ترین احادیث ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ امام مالکؒ ان تمام محدثین میں جن کی کتابیں آج ہمارے سامنے ہیں اور عام مشہور و معروف ہیں، قدیم ترین مجموعہ حدیث کے مرتب ہیں، امام مالکؒ سے زیادہ قربت رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک سے معروف صاحب تصنیف محدثین میں سے کسی اور محدث کو حاصل نہیں تھی۔ علم حدیث میں ایک خاص اہتمام یہ کیا جاتا تھا کہ سند حتی الامکان چھوٹی سے چھوٹی ہو، یعنی راویوں کا بیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنا کم ہو اتنا اچھا ہے۔ ان میں اعلیٰ ترین سند وہ سمجھی جاتی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک کم سے کم واسطے ہوں۔ اور جتنے زیادہ واسطے ہوں اتنا ہی سند نازل مانی جاتی تھی۔ سند عالی یعنی اونچی سند وہ سمجھی جاتی تھی جس میں کم واسطے ہوں۔ اس کے مقابلہ میں سند نازل وہ ہوتی تھی جس میں زیادہ واسطے ہوں، امام مالکؒ کی جتنی سندیں ہیں وہ باقی سب محدثین کے مقابلے میں عالی سندیں ہیں۔ ثلاثیات کتب حدیث میں انتہائی اعزاز کی بات سمجھی جاتی ہے۔ کتب حدیث میں ثلاثیات سے مراد وہ احادیث ہیں کہ جن کے مرتب کرنے والے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان صرف تین واسطے ہوں۔ تین سے زیادہ نہ ہوں۔ امام مالکؒ کی بیشتر سندیں ثلاثی ہیں اور کچھ سندیں ثنائی بھی ہیں جن میں صرف دو واسطے ہیں۔ ایک امام مالکؒ کے استاد اور ایک صحابیؓ۔ چنانچہ امام مالکؒ کی موطا میں بہت سی احادیث ملیں گی۔ مالك عن نافع عن ابن عمر۔ امام مالکؒ اپنے استاد نافع سے روایت کرتے ہیں۔ امام نافع اپنے استاد عبداللہ بن عمرؓ سے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ لہٰذا اس علو اسناد کی رو سے امام مالکؒ کی کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور مبارک سے اقرب ترین کتاب ہے اور وہ اس لئے اصح یعنی صحیح ترین قرار دیئے جانے کے مستحق ہے۔

لیکن امت کی غالب ترین اکثریت کی رائے یہ ہے کہ صحیح بخاری اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے۔ صحیح بخاری اصح الکتب بعد کتاب اللہ جن اسباب کی وجہ سے ہے ان اسباب پر ابھی گفتگو کرتے ہیں۔ لیکن ایک بات ذہن میں رہے کہ موطأ امام مالکؒ کی جتنی صحیح احادیث ہیں وہ ساری کی ساری نہیں تو ان کا بیشتر حصہ صحیح بخاری میں شامل ہو گیا ہے۔ اس لئے جب صحیح بخاری کو اصح الکتب کہا جائے گا تو موطا امام مالکؒ کی صحیح روایات خود بخود اصح الکتب بن گئیں۔ ایک دوسری وجہ موطا امام مالکؒ کو اصح الکتب قرار نہ دینے کی یہ بھی ہے کہ امام مالکؒ جب اپنی کتاب موطا تحریر فرما رہے تھے تو ان کا مقصد صرف اور صرف احادیث کا مجموعہ مرتب کرنا نہیں تھا بلکہ حدیث اور فقہ اور صحابہ اور تابعین کی سنت کی یکجا کرنا مقصود تھا۔ لہٰذا امام مالکؒ کی کتاب میں جہاں احادیث ہیں وہاں صحابہ کے اقوال بھی ہیں اور تابعین کے ارشادات اور آثار بھی ہیں اور اس موضوع پر امام مالکؒ کا اپنا مشاہدہ بھی شامل ہے کہ مدینہ منورہ کا عام طریقہ کیا تھا۔ تو گویا یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کا میدان یا دائرہ کار کتب حدیث سے ذرا مختلف اور بڑھ کر ہے۔ یہ خالص حدیث کی کتاب ان معنوں میں نہیں ہے جن معنوں میں حدیث کی اور کتابیں ہیں، اس میں احادیث کے علاوہ بھی بہت سے مباحث ہیں، امام مالکؒ نے اپنے فتاویٰ بھی اس میں ہیں، بعض جگہوں پر امام مالکؒ کے اپنے ارشادات بھی اس میں بیان ہوئے ہیں۔ تو گویا یہ فقہ اور حدیث دونوں کتابوں کا مجموعہ ہے۔ خالص حدیث کی کتابوں میں صحیح ترین کتاب صحیح بخاری ہے۔ کچھ لوگوں کے نزدیک صحیح ترین کتاب صحیح مسلم ہے۔ بہر حال یہ تین کتابیں طبقہ اول کی کتابیں ہیں۔

طبقہ دوم کی کتابیں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی نظر میں چار ہیں۔ جامع ترمذی، سنن ابوداؤد، نسائی اور مسند امام احمد۔ طبقہ دوم کی کتابیں وہ ہیں کہ جن کی بیشتر احادیث صحیح احادیث ہیں اور اکثر و بیشتر سند کے اعلیٰ معیار پر پورا اترتی ہیں۔ کچھ احادیث ہیں جو صحت کے معیار سے ذرا کم ہیں۔ اور بہت تھوڑی احادیث ہیں جو ضعیف ہیں یا جن کا ضعف بہت نچلے درجے کا ہے، زیادہ سنجیدہ انداز کا ضعف نہیں ہے۔ یہ درجہ دوم کی احادیث ہیں۔

درجہ دوم کی احادیث میں جو بنیادی خصائص ہیں وہ یہ ہیں کہ اگر چہ یہ صحیحین یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے درجہ تک تو نہیں پہنچتیں لیکن ان میں شامل بیشتر احادیث صحیح احادیث ہیں۔ ان کتابوں کے مرتبین نے احادیث میں اپنے لئے جو شروط مقرر کی ہیں اور احادیث کا جو معیار رکھا۔ پھر یہ احادیث جو ان چار کتابوں میں آئی ہیں یعنی ترمذی، ابوداؤد، امام احمد اور نسائی، انہیں امت میں قبول عام حاصل ہوا۔ ایک عام مقبولیت ان احادیث کو حاصل ہوگئی، اور محدثین اور فقہا کا ایک اصول یہ ہے (محدثین اس سے اتفاق کم کرتے ہیں، فقہا زیادہ کرتے ہیں) کہ اگر کوئی حدیث روایت کے اعتبار سے ذرا کمزور بھی ہو لیکن اس کو تلقی بالقبول حاصل ہو تو وہ حدیث قابل قبول ہے۔ تلقی بالقبول ایک اصطلاح ہے، جس کا مطلب امت کے عام اہل علم نے اس کو قبول کیا ہو اور اس پر عمل درآمد کرتے ہوں، وہ حدیث صحیح کی نشانی ہے۔ ورنہ اگر اس میں کوئی کمزوری ہوتی تو امت عام طور پر اس کو قبول نہ کرتے۔ تلقی بالقبول خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ حدیث اونچے درجے کی ہے۔ تو یہ چاروں کتابیں وہ ہیں جن میں درج احادیث کو تلقی بالقبول حاصل ہوئی۔

ان میں احکام شریعت کے تمام بنادی اصول پائے جاتے ہیں۔ شریعت کے جتنے احکام احادیث میں آئے ہیں۔ وہ ساری احادیث بڑی تعداد میں، شاید ننانوے فیصد کے قریب ان کتابوں میں موجود ہیں۔ چنانچہ لوگوں نے لکھا ہے کہ سنن ابوداؤد میں احادیث احکام کا اتنا بڑا مجموعہ ہے کہ سنن ابوداؤد کی گھر میں موجودگی گویا گھر میں ایک بولتے نبی کی موجودگی ہے کہ نبی کے ارشادات ہر وقت آپ کے سامنے رہیں گے۔ اور احکام آپ کو معلوم ہوتے رہیں گے۔

ان کتابوں کے علاوہ احادیث کی جو بقیہ کتابیں ہیں وہ حضرت شاہ ولی اللہ کے نزدیک تیسرے اور آخری درجے میں آتی ہیں۔ یہ وہ کتابیں ہیں جن میں ضعیف احادیث بڑی تعداد میں ملتی ہیں۔ یہ وہ کتابیں ہیں جن کی سندوں میں بعض ایسے راوی آئے ہیں جو مجہول الحال ہیں، جن کی کیفیت معلوم نہیں کہ وہ مستند تھے کہ غیر مستند تھے۔ اس لئے ان احادیث پر صرف وہ لوگ اعتماد کر سکتے ہیں جو علم حدیث کے متخصص ہوں اور فن روایت اور علم رجال میں متعمق ہوں۔ علم حدیث پر اچھی نظر رکھے بغیر ان احادیث میں کمزور یا غیر کمزور کا تعین کرنا بڑا دشوار ہے۔ عام آدمی کے لئے ان کتابوں سے استفادہ کرنا بڑا دشوار ہے۔ اس لئے ان احادیث سے غیر متخصص کو براہ راست استفادہ نہیں کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ بہت سی غلط چیزیں ہوں گی، کمزور چیزیں ہوں گی تو عام آدمی الجھ کر رہ جائے گا اور پریشان ہوگا۔ لہٰذا صرف اہل علم کو ان کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

شاہ ولی اللہ کے علاوہ بقیہ لوگ اس تیسری قسم کی مزید دو قسمیں کرتے ہیں۔ ایک قسم وہ ہے کہ جس میں نسبتاً قابل اعتماد

چیزیں موجود ہیں۔ مثلاً سنن دار قطنی، مصنف ابن ابی شیبہ، مصنف عبدالرزاق، سنن داری۔ یہ وہ ہیں کہ جن میں کچھ نہ کچھ نئی، صحیح اور مستند چیزیں مل جاتی ہیں۔

ان کے بعد چوتھا درجہ ان کتابوں کا ہے جن میں بالکل قصے کہانیاں اور ادھر ادھر کی باتیں ہیں۔ جن کا کوئی پس منظر اور دلیل نہیں ہے۔ جن کے پیچھے کوئی مضبوط سند نہیں ہے۔ وہ قصے کہانیوں کے انداز میں بیان ہوئی ہیں۔ مثلاً دیلمی ایک مشہور محدث ہیں، ان کی کتاب، مسند دیلمی، ہے، اس طرح ابن مردویہ کی کتاب ہے۔ اس طرح سے قصے کہانیوں کی بے شمار کتابیں ہیں۔ جن کا کوئی علمی مقام نہیں ہے اس لئے ان کو بالکل نظر انداز کر دینا چاہئے۔ اس میں اگر کوئی صحیح چیز آگئی ہو تو وہ محض اتفاق ہے، ورنہ اکثر و بیشتر وہ قصے کہانیوں سے عبارت ہے۔

پہلے دو درجے جن میں پہلا درجہ تین بنیادی کتابوں کا اور دوسرا درجہ چار بنیادی کتابوں کا ہے۔ یہ چھ کتابیں ہیں یا سات سمجھ لیں کیونکہ موطا امام مالکؒ کی ساری احادیث صحیح بخاری میں اور صحیح مسلم میں آگئیں، اس لئے اس کو نکال دیتے ہیں۔ جو بقیہ کتابیں ہیں یہ صحت کے اعلیٰ ترین معیار پر فائز ہیں۔ ان کتابوں کی صحاح ستہ کہا جاتا ہے، مسند امام احمد کی بجائے اس میں اکثر لوگ سنن ابن ماجہ کو شامل کرتے ہیں۔ بعض لوگ مسند داری کو شامل کرتے ہیں، لیکن بیشتر لوگ ابن ماجہ کو شامل کرتے ہیں، سنن ابن ماجہ کے ساتھ یہ چھ کتابیں ہیں، جو کتب ستہ یا صحاح ستہ کہلاتی ہیں۔ اگرچہ حدیث کی کسی کتاب میں کہیں یہ الفاظ بیان ہوں کہ رواہ الستہ، تو وہ اسناد کے اعلیٰ ترین معیار پر ہے۔ یعنی صحیح ترین حدیث جسے چھ کے چھ بڑے محدثین نے بیان کیا ہے۔

ان میں سے ہر کتاب کے کچھ الگ الگ خصائص ہیں۔ امام بخاری کی کتاب کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ جو شخص امام بخاری کی کتاب کو غور خوص سے پڑھ لے تو اس میں ایک تفقہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اسے حدیث کے گہرے معانی اور حدیث میں پوشیدہ اور پنہاں اندرونی عبرتوں تک اس کی رسائی ہو جاتی ہے۔ یہ امام بخاری کی کتاب کی بنیادی خصوصیت ہے۔ امام بخاری نے احادیث کے ساتھ ساتھ مختلف حضرات کے بعض اقوال بھی بیان کئے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اقوال، تابعین کے اقوال، بقیہ اہل علم کے اقوال، جن کو بطور حدیث کے وہ نہیں لاتے، بطور سند کے نہیں بیان کرتے، بلکہ کسی چیز کے ثبوت یا تائید کے طور پر بیان کرتے ہیں کہ فلاں نے بھی یہ کہا ہے۔ ان کو تعلیقات کہتے ہیں۔ امام بخاری کے ہاں تعلیقات کی تعداد تین سو سے زائد ہے، جو امام بخاری کی اصل کتاب کے متن کا حصہ نہیں ہیں۔ لیکن جب عنوان شروع کرتے ہیں تو ضمناً وہ بات کہہ دیتے ہیں کہ فلاں شخص نے یہ کہا ہے جس سے اندازہ ہو جائے گا کہ اس حدیث کے معنیٰ کیا ہیں۔ امام مسلم کے ہاں تعلیقات بہت تھوڑی ہیں صرف چودہ پندرہ مقامات پر ہیں۔ گویا امام مسلم کے مندرجات میں صحیح احادیث کی نسبت بہت زیادہ ہے۔ بہ نسبت امام بخاری کے مندرجات کے، اس لئے کہ ان کے ہاں تین سو کے قریب تعلیقات آئی ہیں جو اس معیار کی نہیں ہیں نہ امام بخاری نے

تعلیقات کو بیان کرنے میں اس معیار کو پیش نظر رکھا۔

امام ترمذی کی کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ حدیث کے طالب علم کو حدیث کے ذخائر سے اچھی طرح باخبر کر دیتی ہے۔ امام ترمذی کا اسلوب یہ ہے کہ کوئی حدیث بیان کرنے کے بعد وہ کہتے ہیں: **وفی الباب عن ابن عمرؓ عن عائشہؓ وعن ابی ہریرہؓ**۔ اس موضوع پر حضرت ابن عمر، حضرت عائشہؓ اور ابی ہریرہؓ کی حدیث بھی موجود ہے۔ ایک تو وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اس موضوع پر اور کن کن صحابہ کے بیانات یا روایات موجود ہیں جو بقیہ محدثین بیان نہیں کرتے۔ دوسری بات امام ترمذی کے ہاں یہ ہے کہ وہ حدیث کا درجہ بھی متعین کر دیتے ہیں۔ حدیث بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں: **ھذا حدیث حسن، ھذا حدیث غریب، ھذا حدیث لانعرفہ الامن ھذا الوجہ** ۔ یہ حدیث تو ہے لیکن اس ایک سند کے علاوہ باقی کسی اور سند سے نہیں آئی، یہ کام بقیہ محدثین نہیں کرتے۔ اس اعتبار سے امام ترمذی کی کتاب حدیث کے طلبہ کے لئے بڑی مفید ہے۔

امام ابوداؤد کی کتاب کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں احادیث احکام کا بڑا مجموعہ شامل ہے۔ احادیث احکام کا اتنا بڑا مجموعہ نہ صحیح بخاری میں ہے اور نہ صحیح مسلم میں ہے، نہ ترمذی میں ہے، اور نہ نسائی میں ہے۔ امام ابوداؤد کے بارے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ ان کا تعلق ہمارے پاکستان سے تھا۔ وہ صوبہ بلوچستان کے ایک علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔ تعین کے ساتھ یہ کہنا دشوار ہے کہ کس ضلع سے ان کا تعلق تھا، لیکن غالباً ضلع قلات یا ضلع خضدار سے ان کا تعلق تھا، بعد میں یہاں سے وہ خراسان چلے گئے، خراسان اور نیشاپور وغیرہ میں رہے۔ پھر وہاں سے عرب دنیا اور بغداد وغیرہ میں تشریف لے گئے اور وہاں انہوں نے اپنی یہ بے نظیر کتاب مرتب فرمائی۔ لہٰذا ہم اہل پاکستان صحاح ستہ کے مصنفین میں سے ایک مصنف یعنی امام ابوداؤد کے ہم وطن ہیں۔

امام نسائی کی کتاب کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے حدیث کے متن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ مبارک کی صحت کا بڑا اہتمام کیا ہے۔ احادیث کے متن کو نقل کرنے میں کہیں کہیں اختلافی روایات ہیں۔ ایک صحابیؓ نے ایک طرح سے نقل کیا ہے دوسرے صحابیؓ نے دوسری طرح نقل کیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ بات دو مرتبہ ارشاد فرمائی ہو، اور دونوں مرتبہ مختلف الفاظ میں ارشاد فرمائی ہو۔ ہوسکتا ہے کہ ایک ہی مرتبہ ارشاد فرمائی ہو لیکن ان دونوں سننے والے صحابہ کا لہجہ الگ الگ ہو اور سننے والے نے اپنے لہجے میں بیان کر دیا ہو۔ دونوں چیزوں کا امکان ہے۔ اب ان حالات میں یہ تعین کرنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے کون سا لہجہ نکلا تھا، یہ خاصی محنت اور تحقیق کا کام ہے۔ امام نسائی نے یہ کاوش کی ہے کہ صحت متن کا التزام کریں اور اس بات کو یقینی بنائیں کہ متن زیادہ سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلنے والے الفاظ کے مطابق ہو۔ اسی لئے سنن پر جتنی کتابیں ہیں ان میں ضعیف احادیث کی سب سے کم تعداد سنن نسائی میں ہے۔ یہ نسائی نون کے زبر کے

ساتھ ہے نسائی، اس کا نساء یعنی عورتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ نسا وسط ایشیا میں کوئی شہر تھا، جو آج کل غالباً ازبکستان میں ہے، وہاں سے ان کا تعلق تھا۔

ابن ماجہؒ جو اکثر لوگوں کے خیال میں صحاح ستہ کی آخری کتاب ہے۔ اس میں ترتیب بڑی اچھی ہے۔ پہلے کون سی احادیث ہوں، پھر کون سی ہوں، پھر کون سا باب ہو، پھر بڑے ابواب میں ذیلی ابواب کی تقسیم ہے، پھر چھوٹے ابواب میں انفرادی موضوعات کی تقسیم ہے۔ اس سلسلے میں جن محدث نے سب سے زیادہ مفید اور حسین ترتیب اختیار فرمائی وہ امام ابن ماجہ نے اختیار فرمائی۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم، یہ دونوں صحیحین کہلاتی ہیں، یعنی دو صحیح کتابیں، اور جب شیخین کا لفظ بولا جائے گا تو بھی بخاری و مسلم مراد ہوں گے۔ متفق علیہ کا لفظ بولا جائے گا تو بھی صحیح بخاری و صحیح مسلم مراد ہوں گے۔

امام بخاری نے اپنی کتاب میں ابواب کے جو عنوانات رکھے ہیں، وہ بڑے غیر معمولی ہیں۔ اسی لئے علمائے حدیث نے لکھا ہے کہ فقہ البخاری فی ابوابہ، امام بخاری کو فقہ اور حدیث کی جو سمجھ ہے اور جس گہرائی کے ساتھ شریعت کے احکام کی فہم ان کو حاصل ہے وہ ان کے عنوانات سے سامنے آجاتی ہے۔ امام بخاری کے نزدیک کسی حدیث میں کیا کیا مضامین پنہاں ہیں وہ اس بات سے ہی واضح ہو جاتے ہیں کہ امام بخاری عنوان کیا لگاتے ہیں۔ حدیث کے عنوان سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس حدیث سے امام بخاری کیا سبق نکالنا چاہتے ہیں۔ امام بخاری کے برعکس امام مسلم نے نہ کوئی باب رکھا نہ کوئی عنوان رکھا۔ اگرچہ انہوں نے ترتیب موضوعات کے حساب سے رکھی ہے لیکن کسی باب کو بھی کوئی عنوان نہیں دیا۔ بعد میں آنے والوں میں سے امام نووی نے جو اپنے زمانے کے صف اول کے محدثین میں شمار کئے جاتے ہیں، وہ امام مسلم کی کتاب کے شارح بھی ہیں اور ان کی شرح بڑی مشہور ہے۔ اس میں عنوانات کا اضافہ کیا اور اس کے ساتھ ابواب کی تقسیم بھی کی ہے۔ اسی لئے اگر آپ صحیح مسلم کا نسخہ پاکستان کا یا ہندوستان کا چھپا ہوا دیکھیں، تو صحیح مسلم میں عنوانات حاشیے میں لگے ہوئے نظر آئیں گے۔ اصل کتاب کے متن میں عنوانات نہیں ہیں۔ اس لئے کہ امام مسلم نے اپنی کتاب میں کوئی عنوانات نہیں لگائے تھے۔ عرب دنیا کے چھپے ہوئے جو نسخے ہیں ان میں عنوانات بین القوسین ہیں۔ امام بخاری کے عنوانات بڑے دقت نظر کے حامل ہیں جس کی وجہ سے ان کی کتاب کا درجہ اونچا ہو گیا۔

امام مسلم نے اپنی کتاب کے شروع میں ایک بڑا جامع مقدمہ بھی لکھا ہے۔ امام بخاری نے کوئی مقدمہ نہیں لکھا اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے کتاب شروع کر دی ہے۔ امام مسلم نے اپنی کتاب میں ایک مقدمہ لکھا اور تفصیل سے بیان کیا کہ اس کتاب کے لکھنے کی ضرورت کیوں پیدا ہوئی، اس کتاب میں کن شرائط کا لحاظ رکھا گیا ہے، اس کی وضاحت کی، پھر معاصرت، امکان لقا اور وجوب لقا پر گفتگو کی۔ اس اعتبار سے ان کی کتاب کا درجہ تھوڑا سا اونچا ہے۔ امام بخاری نے کوئی مقدمہ نہیں لکھا۔ کتاب کے بارے میں جو کچھ ان کے ذہن میں تھا وہ کتاب کے مطالعے سے واضح ہو جاتا ہے۔ انہوں

نے خود اپنے اسلوب، مقاصد اور اہداف کو بیان نہیں کیا، جبکہ امام مسلم نے خود بیان کیا ہے۔

امام بخاری کے ان ایک چیز جو ایک پہلو سے بہت مفید ہے اور ایک پہلو سے وہ ہمارے جیسے طلبہ کے لئے مشکل پیدا کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ ان کے ہاں احادیث موضوعات کے اعتبار سے یکجا نہیں ملتیں۔ ایک حدیث کے ایک جملے سے اگر امام بخاری کوئی خاص استدلال کرنا چاہتے ہیں تو اس حصے کو ایک باب میں بیان کریں گے، دوسرے جملے کو کتاب کے دوسرے حصے میں بیان کریں گے، تیسرے جملے کو تیسرے حصے میں بیان کریں گے۔ یہ حدیث اگر ایک سے زائد موضوعات پر مشتمل ہے تو اس کی ایک روایت ایک باب میں آجائے گی، دوسری روایت دوسرے باب میں آجائے گی۔ اگر آپ یکجا دیکھنا چاہیں تو جب تک پوری صحیح بخاری بار بار نہ پڑھیں، اس وقت تک موضوع سے متعلق تمام احادیث کو تلاش کرنا بہت دشوار ہے۔ اس طرح تلاش کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اگرچہ قدیم محدثین ایسے تھے جو زبانی بتادیا کرتے تھے کہ یہ حدیث فلاں باب میں ہے، اور وہ حدیث فلاں باب میں ہے، لیکن آج کل دشوار ہوگیا ہے، لوگوں کا حافظہ اتنا تیز نہیں ہے۔

البتہ مسلم کے ہاں ساری احادیث یکجا مل جاتی ہیں۔ مثلاً امام مسلم جب ایمان پر بات کریں گے تو وہاں ایمان سے متعلق ساری احادیث یکجا مل جائیں گی۔ جہاں علم کی بات ہوگی وہاں علم سے متعلق ساری احادیث یکجا ہوں گی۔ جہاں نفاق سے متعلق بات ہوگی وہاں نفاق سے متعلق ساری احادیث یکجا ہوں گی، یہ فرق اور موازنہ ہے امام بخاری اور امام مسلم کی کتابوں کے درمیان۔

ایک چھوٹا سا فرق اور بھی ہے، بلکہ ایک اعتبار سے یہ ایک بڑا فرق تھا۔ وہ یہ کہ امام بخاری نے ضبط الفاظ پر نسبتاً کم زور دیا ہے۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلنے والے الفاظ کیا تھے۔ جن راویوں نے احادیث کو بیان کیا ہے ان میں اگر متن کا اختلاف ہے تو وہ کیا ہے، اس پر امام بخاری نے زیادہ زور نہیں دیا ہے۔ جبکہ امام مسلم نے اس پر بہت زور دیا ہے۔ مثال کے طور پر امام مسلم جب حدیث بیان کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ حدثنا هناد وعبدالله اللفظ لعبد الله کہ مجھ سے یہ حدیث هناد نے بھی بیان کی، عبداللہ نے بھی بیان کی، اور یہ الفاظ جو میں بیان کر رہا ہوں یہ عبداللہ کے ہیں۔ اس سے گویا اشارہ یہ دینا مقصود ہے کہ هناد نے بھی یہ حدیث بیان کی ہے، لیکن تھوڑے سے لفظی فرق کے ساتھ، دیگر روایات جب سامنے آئیں گی تو آپ کو اس فرق کا اندازہ ہوجائے گا۔ امام بخاری جب حدیث بیان کرتے ہیں تو یہ تعین نہیں ہوتا کہ الفاظ دونوں راویوں کے ایک جیسے تھے یا دونوں کے الفاظ الگ الگ تھے۔ الگ الگ تھے تو یہ الفاظ کس راوی کے ہیں، یہ تفصیل آپ کو امام مسلم کے ہاں ملتی ہے۔

دوسرا بڑا فرق یہ ہے کہ بالکل ابتدائی دور میں، یعنی صحابہ، تابعین اور تبع تابعینؒ کے دور میں اکثر و بیشتر لوگ بلکہ سارے ہی لوگ انتہائی مخلص، سچے، ذمہ دار، تقویٰ رکھنے والے اور خوف خدا سے سرشار ہوتے تھے، اس لئے کسی کے بارے میں یہ شبہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ بیان کرنے میں کوئی کوتاہی کرے گا۔ لیکن بعد میں ایسے لوگ بھی میدان میں آگئے جن کے بارے میں

یہ محسوس کیا گیا کہ شاید یہ پوری ذمہ داری سے کام نہ لیں۔ چونکہ محدثین کی معاشرے میں بہت عزت ہوئی، لوگوں نے ان کو ہاتھوں ہاتھ رکھا اور ان کا احترام بادشاہوں سے بھی زیادہ ہونے لگا، تو بہت سے ایسے لوگ بھی میدان میں آ گئے جن کا مقصد دنیاوی عزت تھا، یا کم از کم جزوی طور پر وہ دنیاوی عزت میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ جوں جوں ایسے لوگوں میں اضافہ ہوتا گیا محدثین اپنا معیار کڑا کرتے گئے، بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کو مزید سخت کرتے گئے۔

اب تک حدیث بیان کرنے کے دو طریقے ہوتے تھے۔ ایک طریقہ یہ ہوتا تھا کہ طلبہ سامنے بیٹھ گئے۔ محدث، مثلاً امام بخاری نے اپنی یادداشت یا اپنے تحریری ذخیرے سے حدیث بیان کرنی شروع کردی اور لوگوں نے لکھنا شروع کردی، لوگوں کی تعداد خاصی بڑی ہوتی تھی اور درمیان میں مستملی بھی ہوتے تھے یعنی ہر دو چار سو آدمیوں کے درمیان ایک آدمی بیٹھا ہوتا تھا جو بلند آواز سے ان الفاظ کو دہراتا تھا۔ جیسے مکبر اذان کے الفاظ دہراتا ہے یا نماز میں اللہ اکبر دہراتا ہے۔ بعض اوقات کئی کئی سو مستملی ہوا کرتے تھے، جو ان الفاظ کو دہرایا کرتے تھے۔ محدث نے ایک لفظ زور سے کہا کہ انما الاعمال بالنیات، اب پہلے مستملی نے دہرایا، پھر دوسرے نے پھر تیسرے نے پھر چوتھے نے، اور کوئی پندرہ بیس منٹ میں سب لوگوں نے لکھا۔ پھر اس نے اگلا جملہ بولا پھر اس سے اگلا۔ ایک طریقہ تو یہ تھا۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ طلبہ کے پاس تحریر ذخیرے موجود ہیں۔ امام بخاری نے جو لکھا، طلبہ نے اس کے تحریری نسخے پیشگی ہی حاصل کر لئے۔ لیکن اب طالب علم امام بخاریؒ کو سنا رہا ہے اور سننے کے دوران جہاں غلطی ہے وہ ٹھیک کر دیتے ہیں اور غلطی نہیں ہے تو سن کر کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے، میں نے اجازت دے دی ہے، اب تم میری طرف سے روایت کر سکتے ہو۔ بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ سب سے پڑھ کر سنتے تھے۔ اگر چار پانچ ہزار طلبہ ہوں تو سب سے پڑھوا کر نہیں سنا جا سکتا۔ اس میں تو ایک ایک حدیث کے لئے پورا سال چاہئے۔ اس کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ ایک طالب علم پڑھتا تھا اور بقیہ سنتے تھے اور پھر امام بخاری یا جو بھی محدث ہوتے تھے وہ اجازت دیتے تھے کہ اس طرح سے آپ سب لوگوں کو پڑھنے کی اجازت ہے۔ درمیان میں بطور احتیاط کسی سے سن بھی لیا، کبھی ایک سے کبھی دوسرے سے، اور سب کے بارے میں اندازہ ہو گیا کہ سب نے پڑھا ہے۔

بعد میں محدثین نے ان تینوں طریقوں کے تین درجات مقرر کئے۔ یہ تین گویا الگ الگ درجات ہو گئے۔ ایک تو وہ کہ جس میں محدث نے خود پڑھا اور لوگوں نے سنا۔ دوسرے میں طالب علم نے خود پڑھا اور محدث نے سنا۔ تیسرے میں ایک طالب علم نے پڑھا اور محدث نے سنا۔ لیکن دوسرے بہت سے طلبہ نے بھی سنا۔ امام مسلم کے ہاں ان تینوں میں الگ الگ فرق کیا گیا ہے۔ امام بخاری کے ہاں یہ فرق نہیں ہے۔ امام مسلم کی اصطلاح یہ ہے کہ اگر امام مسلم نے کہا کہ حدثنا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ امام مسلم کے استاد نے حدیث پڑھی، امام مسلم نے سنی اور سن کے لکھی۔ اگر امام مسلم نے کہا کہ اخبرنا، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ امام مسلم نے حدیث پڑھی، ان کے استاد نے سنی اور سن کے اجازت دے دی۔ اور

اگر کہیں ایسا ہوا کہ امام مسلم اپنے استاد کے درس میں موجود تھے، کسی اور نے حدیث پڑھی امام مسلم نے سنی تو امام مسلم کہتے ہیں کہ اخبرنا فلان قرأة علیه وانا اسمع، ان کے سامنے پڑھا جارہا تھا اور میں سن رہا تھا۔ آپ دیکھیں کہ accuryacy کی اس سے بہتر مثال دنیا میں کہیں مل نہیں سکتی۔ اگر آپ یہودیوں اور عیسائیوں کے سامنے یہ بیان کریں تو وہ دنگ رہ جائیں گے کہ کسی کام میں اتنی accuryacy بھی ہوسکتی ہے کہ محدث نے خود نہیں پڑھا، میرے استاد کے سامنے پڑھا جارہا تھا، اور دوسرے طالب علم کے ساتھ ساتھ میں سن رہا تھا، استاد نے اس طرح سن کر اس کی اجازت دی تھی۔ یہ باریک فرق امام مسلم کے ہاں ہے اور امام بخاری کے ہاں نہیں ہے۔

تعداد کے اعتبار سے صحیح مسلم کی احادیث زیادہ ہیں، صحیح بخاری کی احادیث کم ہیں۔ آپ کو پتہ ہے کہ حدیث کی ہر کتاب میں ایک ایک حدیث بار بار آتی ہے، مثلاً ایک حدیث میں اگر خطبہ حجۃ الوداع کا ذکر آئے گا تو اس میں درجنوں موضوعات پر بات ہوئی ہے۔ تو جہاں عورتوں کے حقوق کا ذکر ہے وہاں خطبہ حجۃ الوداع کا بھی ذکر آئے گا، جہاں لوگوں کی مساوات کا ذکر ہے وہاں بھی اس خطبے کا حوالہ آئے گا۔ جہاں حج کے احکامات کا ذکر ہے وہاں بھی خطبے کا کوئی نہ کوئی حصہ زیر بحث آئے گا۔ جہاں منیٰ کا ذکر ہے وہاں بھی آئے گا۔ جہاں عرفات کا ذکر ہے وہاں بھی آئے گا۔ اس طرح ایک حدیث کئی ابواب میں آئے گی۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث کی کتابوں میں تکرار اور مکررات بہت ہوتے ہیں۔ مکررات کو نکالے بغیر اگر صحیح بخاری کی احادیث کو گنا جائے تو صحیح بخاری کی احادیث کی تعداد نو ہزار بیاسی ہے۔ یہ تعداد حافظ ابن حجر نے بیان کی ہے۔ اس میں مکررات بھی شامل ہیں، تعلیقات بھی شامل ہیں، متابعات بھی شامل ہیں اور شواہد بھی شامل ہیں۔ مکررات کو اگر نکال دیا جائے اور صرف وہ احادیث جو براہ راست پوری سند کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہوئی ہیں وہ شمار کی جائیں تو دو ہزار چھ سو دو ہیں۔ اس کے برعکس صحیح مسلم میں کل چار ہزار احادیث ہیں۔ گویا چار ہزار احادیث صحیح مسلم میں ہیں، اور دو ہزار احادیث صحیح بخاری میں ہیں۔

احادیث کی کل تعداد کیا ہے؟ اس کے بارے میں کچھ کہنا بڑا دشوار ہے۔ لیکن ایک عام اندازہ یہ ہے کہ مکررات کو نکالنے کے بعد کل متون تیس سے چالیس ہزار کے درمیان ہیں۔ آج کل کمپیوٹر کا زمانہ ہے، بہت سے لوگوں نے حدیث کی کتابیں کمپیوٹرائز کرنا شروع کی ہیں، کچھ دنوں کے بعد جب ساری کتابیں کمپیوٹرائزڈ ہوجائیں گی تو تمام احادیث کی اصل تعداد سامنے آجائے گی۔ اس میں بھی قطعیت کے ساتھ تعداد کا تعین کرنا دشوار ہوگا۔ اس لئے کہ کمپیوٹر مکررات کی شناخت نہ کرسکے گا۔ ایک حدیث کے الفاظ اگر مختلف ہیں، لیکن مفہوم ایک ہے تو کمپیوٹر اس کو دو احادیث قرار دے گا، لیکن حدیث کا طالب علم اسے ایک ہی حدیث سمجھے گا۔ اس لئے قطعیت کے ساتھ کمپیوٹر کے لئے بھی دشوار ہوگا کہ بالکل درست تعداد بتا سکے۔

حجیت سنت یعنی کہ سنت کتاب اللہ کے ساتھ حجت ہے اور قرآن مجید کے احکام کی شارح ہے۔ اس پر فقہائے اسلام نے بڑی تفصیل کے ساتھ غور کیا ہے اور سنت کے کردار پر بات کی ہے۔ قرآن مجید میں بنیادی اصول یعنی اصول عامہ

ہیں۔سنت میں ان اصولوں کی تطبیق بیان کی گئی ہے،قرآن پاک میں اجمال ہے۔سنت میں تفصیل بیان کی گئی ہے۔مثلاً قرآن پاک میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فریضہ یہ ہے کہ ﴿لتبین للناس مانزل الیھم﴾ کہ جو کچھ اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے اس کو لوگوں کے سامنے کھول کر بیان کردے۔بیان کی مختلف قسمیں ہیں،اب یہاں کون سی قسم مراد ہے؟ ﴿اقیمو ا الصلوٰۃ﴾ میں الصلوٰۃ سے مراد کیا ہے۔﴿وللہ علی الناس حج البیت﴾ میں حج سے مراد کیا ہے؟ ﴿خذ من اموالھم صدقۃ﴾ میں صدقے سے مراد کیا ہے؟ یہ ساری چیزیں محتاج وضاحت ہیں،اور سنت کا کام یہ ہے کہ ان چیزوں کی اصل معنیٰ کو واضح کردے۔

سنت اگر نہ ہو تو پھر قرآن پاک کے ان الفاظ کے کوئی معنیٰ متعین نہیں کئے جاسکتے۔نہ لغت کی مدد سے متعین کئے جاسکتے ہیں نہ کسی اور ذریعے سے۔قرآن پاک میں اس طرح کے درجنوں نہیں سینکڑوں احکام ہیں،جن کی کوئی تعبیر وتشریح کسی کے لئے ممکن نہیں ہے،اگر سنت کی تعبیر وتشریح ہمارے سامنے نہ ہو۔

اس طرح قرآن پاک کی کچھ آیات میں کچھ الفاظ ہیں جن کے لئے مبہم کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے،یعنی ان کی مراد واضح نہیں ہے،سنت سے ان کی تفسیر ہوجاتی ہے۔کچھ آیات ہیں جو مطلق ہیں،سنت سے ان کی تقیید ہوجاتی ہے،سنت اس کو مقید کردیتی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے۔کچھ الفاظ ہیں جو قرآن مجید میں عام استعمال ہوئے ہیں،سنت ان کو خاص کردیتی ہے کہ اس سے خاص مراد یہ ہے اور اس سے باہر نہیں ہے۔کچھ احکام ہیں جن کے لئے تشریح کی ضرورت ہوتی ہے کہ ان کو نافذ کیسے کیا جائے گا،سنت سے ان احکام کی شرح ہوجاتی ہے۔قرآن پاک میں کچھ احکام ہیں کہ سنت سے اس کے دائرے میں توسیع ہوجاتی ہے کہ اگرچہ اس کا دائرہ بظاہر یہاں تک معلوم ہوتا ہے لیکن اس کا انطباق آگے بھی ہوگا۔کچھ چیزیں ایسی ہیں کہ قرآن میں ان کے متعلق ایک اصول آیا ہے لیکن اس اصول سے کون کون سے جزوی مسائل نکلتے ہیں،ان کی مثالیں سنت نے دے دی ہیں۔یہ کام ہے، قرآن پاک کی رو سے سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کام ہے کہ ان سب چیزوں کی وضاحت کرے۔مثال کے طور پر قرآن پاک میں ایک اصول دیا گیا کہ:

لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ سمجھنا درست نہیں ہوگا کہ سنت کا کام بس یہی ہے کہ قرآن پاک کے اجمال کی تفصیل کرے یا اس کے دائرے میں توسیع کردے اور اس کے علاوہ سنت کا کوئی کردار نہیں۔سنت کا کردار براہ راست احکام دینا بھی ہے۔قرآن پاک میں ہے کہ ہم نے رسول کو بھیجا،﴿لیحل لھم الطیبات ویحرم علیھم الخبائث﴾ تاکہ وہ رسول طیبات کو ان کے لئے حلال قرار دے اور خبائث کو ناجائز قرار دے۔گویا رسول صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی جس چیز کو طیب دیکھیں اس کو جائز قرار دیں اور جس چیز کو خبیث دیکھیں اس کو حرام قرار دے سکتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ جائز وناجائز کے کئی ایسے احکام ہیں جو سنت میں براہ راست ملتے ہیں،جن کی کوئی بنیاد براہ

راست قرآن پاک میں نہیں ہے۔ مثلاً خیار شرط کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی ہے۔ ایک صحابیؓ تھے جو بڑے سادہ لوح تھے ان کا نام حبان بن منقذ تھا۔ وہ جب خرید وفروخت کرتے تھے تو اکثر دھوکہ کھا کے آتے تھے۔ گھر والے کہتے تھے کہ آپ تو یہ چیز مہنگی لے آئے، آپ تو غلط لے آئے، یہ تو سستی مل سکتی تھی، انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ میں اس طرح جاتا ہوں اور خریداری کر کے گھر واپس آتا ہوں تو گھر والے کہتے ہیں کہ یہ سودا تو غلط ہوا، دوبارہ بازار جاتا ہوں تو بازار کے لوگ مانتے نہیں، مجھے کیا کرنا چاہئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم آئندہ خرید وفروخت کرو تو یہ کہہ دیا کرو کہ میں دھوکہ نہیں دینا چاہتا، مجھے اختیار ہوگا کہ میں تین دن تک چاہوں تو اس کو واپس کر سکتا ہوں، شرط رکھ لیا کرو۔ یہ بنیاد ہے تین دن کی شرط کی کہ گویا اگر کوئی خریدار تین دن خیار شرط رکھنا چاہے کہ میں تین دن تک اس پر دوبارہ غور کر سکتا ہوں اور اگر رائے بدلی تو واپس کر سکتا ہوں تو اس کی اجازت ہے، اگر دونوں فریق طے کریں۔ اس کی کوئی بنیاد براہ راست قرآن پاک میں نہیں ہے۔ لیکن بالواسطہ تراضی میں یہ بھی شامل ہے کہ اگر دونوں فریق راضی ہوں تو یہ ہو سکتا ہے۔ لہٰذا قرآن پاک میں اس کی حکم کی بالواسطہ بنیادیں تو ہیں، لیکن براہ راست بنیاد کا تعین کرنا مشکل ہے۔

شفعہ کے بارے میں حدیث میں ہے کہ اگر آپ کے پڑوس میں کوئی جائیداد مل رہی ہو، یا آپ کسی جائیداد میں شریک ہوں، اس میں آپ کا حصہ ہو، اور ایک حصہ دار اپنا حصہ بیچنا چاہے تو یہاں پہلا حق آپ کا ہے بہ نسبت غیر آدمی کے۔ آپ نے اپنی بہن کے ساتھ مکان بنایا ہے اوپر وہ رہتی ہے نیچے آپ رہتے ہیں۔ اب بہن اپنا حصہ بیچنا چاہتی ہے۔ بجائے اس کے کہ کوئی غیر آدمی آئے اور آپ کو اس سے زحمت ہو، آپ کو شریعت نے یہ اختیار دیا ہے کہ آپ شریک جائیداد سے کہیں کہ یہ حصہ کسی اور کو دینے کے بجائے مجھے دے دو۔ اب بہن کی ذمہ داری ہے کہ پہلے آپ کو ترجیح دے اور آپ کے ہاتھ فروخت کرے۔ یہ شفعہ کے بارے میں شریعت کا حکم ہے جو آج دنیا کے بہت سے قوانین میں استعمال ہوتا ہے اور اب دنیا اس سے مانوس ہوگئی ہے، لیکن انگریز کے زمانے سے پتہ نہیں کیوں یہ چلا آرہا ہے کہ شہری جائیداد پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا، کیوں نہیں ہوتا؟ ہونا چاہئے، شریعت کا منشا تو جائیداد پر حق شفعہ کے لاگو ہونے سے ہی پورا ہو سکتا ہے، یہاں شہری جائیداد کا استثنا کر دیا گیا ہے اور غیر شہری جائیداد پر ہی اس کا انطباق ہوتا ہے۔

یہ اس موضوع پر گفتگو کا مختصر خلاصہ ہے کہ سنت ماخذ شریعت ہے۔ کس طرح ماخذ شریعت ہے، اس کے احکام میں احادیث کے درجات کا لحاظ رکھا جائے گا۔ صحت کے لحاظ سے، ثبوت کے اعتبار سے اور معنیٰ کے اعتبار سے احادیث کے جو مختلف درجات ہیں، ان سب کو پیش نظر رکھ کر طے کیا جائے گا کہ کس حدیث سے کون سے احکام نکلتے ہیں۔ اسی کے حساب سے احکام کا درجہ متعین ہوگا۔

☆☆☆